قیمتِ ہر شے زاندازِ نگاہ

اسلامی تعلیم کے گزشتہ شمارہ (مئی، جون ۱۹۷۵ء) میں جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنے مقالہ "علم اور مذہبی واردات" میں جو تصریحات فرمائی ہیں ہمیں انہیں تسلیم کرنے میں سخت تردد ہے اور ہمارا تاثر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے عالمِ افکار سے نکل کر علامہ اقبالؒ کے افکار کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، بقولِ اقبال ؎ عالمِ افکار تو زندانِ تست

ڈاکٹر صاحب موصوف سے زیادہ اس حقیقت سے اور کون باخبر ہوگا کہ کسی مصنف کے مؤقف سے واقف ہونے کے لئے اس کے مطالعہ کی کوئی منہاج (Method) طے کر لینا چاہیئے اور یہ طے کرنے میں اس کے اپنے دعاوی کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اب اگر علامہ اقبال کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کا پیغام درحقیقت قرآن کا پیغام ہے اور "حرفِ پیچاپیچ" (فلسفہ) اور "حرفِ نیش دار" (شاعری) کا مقصد عقل و دل کو اپیل کر کے ملتِ اسلامیہ کے احیاء کے سوا کچھ اور نہیں تو ہمیں ان کے ارشادات کی تشریح و توضیح میں ایسے معانی کو بہرحال ترجیح دینا چاہیئے، جو قرآن سے قریب تر ہو۔ دوم یہ کہ علامہ اقبال کے نظریات فقط ان کے خطبات تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ان کا شعری کلام، ان کی بے شمار بکھری ہوئی نثری تحریریں اور بعض نجی خطوط بھی ان کے نظریات کی وضاحت کرتے ہیں اور علامہ اقبالؒ کے اصل مؤقف کے تعین میں صرف ایک چیز کو لے لینا اور دوسری تمام چیزوں کو نظر انداز کر دینا سخت ناانصافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ محنت طلب راستہ اختیار کرنے کے بجائے بڑی سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنی بحث کو اُن کے خطبات تک محدود کر دیا ہے۔ جن کے بارے میں خود علامہ اقبال کی رائے یہ ہے کہ ان کے مخاطب فقط وہ لوگ ہیں جو حسیت پسند مزاج اور ذہن (Empiricist) رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کاوش صرف اسی صورت میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کر سکتی تھی کہ وہ خطبات کی تشریح اُن کی شاعری اور دیگر تحریروں کی روشنی میں کرتے۔ رشید احمد صدیقی نے نقوش اقبال کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا ہے: "اقبال کے مشہور لیکچرز "اسلام کی تشکیلِ نو" میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو جہاں تہاں تسلیم کرنے میں اکثر علماء کو تامل ہوا ہے لیکن انہی حقائق کو اُن کی شاعری میں سُن کر یا پڑھ کر

بے ساختہ قائل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جیسے وہ نکتے اپنے تمام معارف و بصائر کے ساتھ براہِ راست ان پر منکشف ہو گئے ہوں۔" اسی طرح وہ دوسری طرف یہ فرماتے ہیں "ہم پر عام طور سے آج مذہب کا جو اثر ہے بالخصوص ان پر جو مذہب کو اتنا اعتقاد سے نہیں جتنا عقل سے دیکھنے پرکھنے کے شائق ہیں وہ براہِ راست اتنا مذہبی تصانیف کا نہیں جتنا علامہ اقبالؒ کے اس کلام کا جس میں مذہب، اخلاق اور تاریخ کے تقاضوں کی طرف رہبری ملتی ہے۔" رموزِ بیخودی پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے اقبال کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ڈاکٹر اقبال حقائق کی تعلیم و تلقین کے لئے "اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اور اس لئے وہ اختلاف مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے خطبات پر بحث کرتے وقت ان کے شعری کلام اور دیگر تحریروں کو یکسر نظر انداز کر کے اپنے مقالہ میں اقبال کے نظریات کی ایسی یک رُخی تاویل کی ہے کہ ان کا یہ "توسیعی" لیکچر توسیعی یا توضیحی تو رہا نہیں، البتہ تردیدی اور تنقیصی ضرور بن گیا ہے۔ معلوم نہیں ہمارے یہ علماء و فضلا علامہ کے افکار کی ایسی دُور از کار تاویلات سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال کی قد آور شخصیت کو مسمار کرنے کی اسی قسم کی ایک کاوش علی عباس جلالپوری اپنی کتاب "علامہ اقبال کا علم الکلام" میں بھی کر چکے ہیں جس کے ہر صفحے سے ان کے معاندانہ رویے کی عکاسی ہوتی ہے اور تو اور اب ایسے مخلصین اقبال بھی نکل آئے ہیں جنہیں اس بات پر اصرار ہے کہ علامہ اقبال کو "رحمۃ اللہ علیہ" نہ کہا اور نہ لکھا جائے کیونکہ وہ تو فقط "مرحوم" ہیں: بقول اقبال علیہ الرحمۃ

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے ۔۔۔ جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس بات کا اعلان ایک ایسی قرآن کانفرنس میں کیا گیا جس میں علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ایک باقاعدہ نشست کا خصوصیت سے اہتمام کیا گیا تھا۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات یہ نہیں کہ علامہ اقبال معصوم تھے یا منزہ عن الخطا تھے لیکن ان کے بارے رائے قائم کرنے میں یہ ناانصافی تو روا نہیں رکھی جا سکتی کہ اشعار اور خطبات کے جملوں کی جزواً جزواً اور الگ الگ تشریح کر کے غلط نتائج اخذ کیے جائیں۔ ایسی کوششوں سے یہ ناقدینِ اقبال نہ تو خود اپنی علمی حیثیت کو بلند کر سکتے ہیں اور نہ ہی علامہ اقبال کے علمی مرتبہ و مقام کو گھٹا سکتے ہیں۔

اب آئیے ڈاکٹر صاحب کے مقالہ میں مشمولہ مباحث کی طرف!

آغازِ مقالہ میں ہی ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے خطبہ پر اپنا فیصلہ (Judgement) صادر فرما دیتے ہیں:

"اس بحث کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ فلسفے اور مذہب دونوں کا مقصد علم ہے۔ استدلال کی بنیاد

یہ ہے کہ اُن کا مسئلہ بعینہٖ ایک ہے اور جس نتیجے پر یہ استدلال پہنچاتا ہے یہ ہے کہ اُن کا منہاج بھی بعینہٖ ایک ہے، اور وہ منہاج وجدان ہے۔"

بہتر ہوتا کہ ایک ہی جست میں یہ نتائج اخذ کر کے فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب یہ معلوم کرنے کی کوشش تو فرماتے کہ اس خطبے میں خود علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر اُن کے اپنے ہی الفاظ میں کیا مقصد تھا۔ علامہ فرماتے ہیں:

"I propose in this lecture to consider the character of knowledge and religious experience."

حضرت علامہ تو علم اور مذہبی واردات کی نوعیتوں کی وضاحت فرمانا چاہتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو خواہ مخواہ یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ علامہ اقبال مذہبی حقائق کو معقولاتِ علم میں تبدیل کر کے مذہبی واردات اور اس کے امتیازی تصورات مسخ کر رہے ہیں۔ حالانکہ علامہ اقبال نے صرف اپنی شاعری میں ہی اس بات کا اعلان نہیں کیا کہ

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

بلکہ جس لیکچر کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ اور مذہب کی عینیت کا مفروضہ قائم کر کے علامہ کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے اسی میں علامہ اقبال نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ فلسفہ کو مذہب پر اگر کوئی فیصلہ دینا ہے تو مذہب کے ماتحت رہ کر ہی وہ ایسا کرنے کا مجاز ہے نہ کہ فلسفے کو مذہب پر فوقیت دی جائے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مذہب زندگی کا کوئی جزوی شعبہ نہیں، بلکہ یہ فکر، جذبہ، عمل یعنی پوری زندگی کو محیط ہے۔ بہتر ہو گا اگر بات ان کے اپنے الفاظ میں بیان کی جائے۔

While sitting in judgement on religion, philosophy cannot give religion an inferior place. Religion is not a departmental affair, it is neither mere thought, nor mere feeling nor mere action, it is the expression of the whole man. Thus in the evaluation of religion, philosophy must recognise the central position of religion and has no other alternative but to admit it as something focal in the process of reflective synthesis."

اسی طرح مذہب کا جوہر علامہ اقبالؒ کے نزدیک "ایمان" ہے جو بے منتِ عقل، ایک پرند کی طرح، اپنا بے نشان راستہ دیکھ لیتا ہے۔

The essence of religion, on the other hand, is faith; and faith like the bird sees its "trackless way" unattended by intellect....

معلوم نہیں لیکچر کے اوّلین دو صفحوں پر حضرت علّامہ کی ان واضح تصریحات کے باوجود ڈاکٹر صاحب علّامہ اقبال پر کیوں یہ الزام دھرتے ہیں کہ "اُن کی کوشش یہ ہے کہ اس یقین کو علم میں تبدیل کر دیا جائے۔" ڈاکٹر صاحب کی دلیل یہ ہے کہ علّامہ اقبال کے نزدیک مذہب کی عقلی اساس کی تلاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اپنی ذات سے ہوتی ہے جن کی مسلسل یہ دعا ہے۔

اللّٰھمّ ارنی حقائق الاشیا کما ھی

لیکن سوال یہ ہے کہ جب خود قرآن حکیم انفس و آفاق میں پائی جانے والی آیات الٰہی پر بار بار تعقل و تفکّر کی دعوت دیتا ہے تو کیا یہ بھی ایمان اور یقین کو علم میں تبدیل کر دینے کی کوشش ہے؟ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا "رب ارنی کیف تحی الموتیٰ" کی استدعا، اللہ تعالیٰ کا "اولم تومن" فرمانا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پھر "ولکن لیطمئن قلبی" پر اصرار بھی مقولات مذہبی کو مقولات علمی میں تبدیل کر دینے کی کوشش ہے؟ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اس قرآنی قصّے کے مطابق پیغمبر کا یقین راسخ بھی عقلی اساس کا طالب نظر آتا ہے تو "اللّٰھم ارنی حقائق الاشیا کما ھی" کی دعا میں ڈاکٹر صاحب کو کیوں قباحت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی دلیل یہ ہے کہ غور و فکر کی ضرورت ہی اس وقت پیش آتی ہے جب معتقدات کے بارے میں شکوک پیدا ہوتے ہیں حالانکہ قرآن کی یہ آیت

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم و یتفکّرون فی خلق السّمٰوٰت والارض

کے مطابق ایمان اور ذکر دوام کے بعد بھی غور و فکر کی ضرورت مسلّم ہے۔ درحقیقت جب ڈاکٹر صاحب مقولاتِ مذہبی اور مقولات علمی کی بات کرتے ہیں تو وہ اپنے بارے میں قرآن سے کہیں زیادہ کانٹ کے زیر اثر ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ورنہ قرآن تو ذکر کے علاوہ مسلسل تعقّل و تفکّر کے ذریعے "ایمان" کی آبیاری کر کے انسان کو "قلبہ مطمئن بالایمان (سورہ نحل) کے درجے تک پہنچانا چاہتا ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب اپنے مقالہ میں بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عام آدمی کا ایمان مانگا ہوا اور شبہات سے آلودہ ہوتا ہے۔ اطمینان کا درجہ لازماً ایمان سے آگے ہے۔ جسے علّامہ اقبال اپنی شاعری میں "نظر" اور خطبات میں Discovery یا Direct contact with ultimate Reality کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں مذہب بصیرت (نظر یا Discovery) کا

معاملہ صرف پیغمبر کی ذات میں بنتا ہے لیکن قرآن کی رُو سے بصیرت پیغمبر کو ہی نہیں بلکہ اُس کے متبعین کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ واسطہ پیغمبر کا ہی سہی لیکن بصیرت تو بہر حال بصیرت ہی ہے۔

قل ھذہٖ سبیلی أدعوا الی اللّٰہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی (سورہ یوسف ۱۰۸)

Direct contact with ultimate Reality کے الفاظ پر ڈاکٹر صاحب معترض ہوتے ہُوئے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ.... تمام صوفیانہ وجدان و واردات سے ماوراء ہے۔ نہیں ہر محسوس و معقول سے ماوراء ہے۔"

لیکن کیا ڈاکٹر صاحب اس بات کی وضاحت فرمائیں گے کہ مقولات مذہبی میں ایک نہایت ہی اہم اصطلاح "قرب" بھی ہے اور قرآن جب یہ فرماتا ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید اور تاکید کرتا ہے واسجد واقترب تو یہ "قرب" کس قسم کا ہے اور وراء الوراء کے ساتھ یہ قرب کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس کا انگریزی میں ترجمہ Direct contact with ultimate Reality کیا جا سکتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اگر وجدان کو خدا کی ہستی کے مشاہدے کا معیار تسلیم کیا جائے تو پھر صوفی اس مضمر یقین کی احتیاج سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے قرآن پر رکھنا ضروری ہے مگر ڈاکٹر صاحب اس بات کو کیوں یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ یہ بھی تو علامہ اقبال ہی کا قول ہے کہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

چنانچہ صوفیانہ واردات کے بارے میں اُن کا اپنا نظریہ مندرجہ ذیل شعر میں بیان ہُوا ہے۔

پس طریقت چیست اے والاصفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

اسی طرح آخری خطبہ میں مذہبی تجربے کی تیسری منزل Discovery کی تعریف علامہ اقبال مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

"In the third period metaphysics is displaced by psychology and religious life develops the ambition to come into direct contact with ultimate reality. It is here that religion becomes a matter of personal assimilation of life and power; and the individual achieves a free personality, not by releasing himself from the fetters of the law but by discovering the ultimate source of law within the depths of his own consciousness".

اور خواجہ حسن نظامی کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء میں فرماتے ہیں۔

"آپ کے تصوّف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہوگا کہ شان عبدیت انتہائی کمال روحِ انسانی کا ہے"

ڈاکٹر صاحب نے اگر یہ خط نہ دیکھا ہو تو ازرہ کرم ضرور ملاحظہ فرمائیں جو اوراق گم گشتہ (مصنفہ رحیم بخش شاہین) (صفحہ ۳۰۲ تا ۳۰۶) میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی شہرۂ آفاق کتاب "شیخ مجدد کا نظریہ توحید" (اور ڈاکٹر صاحب کا عمر بھر کا علمی کارنامہ فقط یہی اکلوتی کتاب ہے۔ جس پر آپ کو علی گڑھ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی تھی) کا پورا نچوڑ اس تین صفحے کے خط میں موجود ہے جو ڈاکٹر صاحب کی تصنیف سے بیس سال پہلے لکھا گیا ہے اور فلسفیانہ شعور اور مذہبی شعور کے امتیازات ایسی خوبصورتی اور وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں کہ اسے پڑھ لینے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تصنیف میں کوئی بات نئی نظر نہیں آتی۔

غرض یہ کہ علامہ اقبال کے پیش نظر Direct contact with Reality کا مطلب قرآن کی اصطلاح میں "قرب"، "نفس مطمئنہ" اور "راضیۃ مرضیہ" کے سوا کچھ اور نہیں۔ کیونکہ بقول علامہ اقبالؒ

از جدائی گرچہ جاں آید بلب ؎ وصل او کم جو رضائے او طلب

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال نے فلسفیانہ شعور اور مذہبی شعور کے امتیازات کو پیش نظر نہیں رکھا۔

سب سے زیادہ خوفناک اعتراض جو ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال پر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابن صیاد کے قصے کو وجدان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جائزہ کو بطور سند پیش کر کے وحی اور صوفیانہ واردات کے درمیان امتیاز کو مٹانے کی کوشش کی ہے حالانکہ وحی کو امکان خطا سے پاک اور صوفیانہ واردات کو احتمال خطا کی وجہ سے ایک غیر یقینی ذریعہ علم ماننا لازم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ الزام علامہ اقبال کے ساتھ ناانصافی کی انتہا ہے ابن صیاد کے واقعہ کے بیان کے متصلاً بعد علامہ اقبال کے الفاظ یہ ہیں۔

The prophets companions, some of whom were present during the course of the psychological observation in the history of Islam and even later traditionists who took good care to record this important fact, entirely misunderstood the significance of his attitude and interpreted it in their own innocent manner. Professor Macdonald

who seems to have no idea of the fundamental psychological difference between the mystic and prophetic consiousness finds humour enough in this picture of one prophet trying to investigate another after the method of the society of Psychical Research.

علامہ اقبال کے اس واشگاف بیان کے باوجود اگر ڈاکٹر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے وحی اور صوفیانہ واردات میں امتیاز نہیں کیا تو یہ ستم ظریفی کی حد ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا اپنا مؤقف کیا ہے؟ اس سلسلے میں آپ کی کتاب "شیخ مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید" کے دیباچہ سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"But just as the question: What is the nature of knowledge (Metaphysical) and what are its implications cannot be discussed without reference to philosopners like Kant and Hegel, in the same manner the question of nature and implications of Religion could not be answered without reference to the most highly developed religious consciousness of Muhammad himself."

ذرا آپ کے الفاظ most highly developed religious consciousness پر بھی غور فرمائیں اور علامہ اقبال کے الفاظ fundamental psychological difference between mystic & prophetic consciousness. کو بھی پیش نظر رکھیں اور یہ فیصلہ ڈاکٹر صاحب خود کریں کہ یہ امتیازات کون ختم کر رہا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ اُن کی محولہ بالا تحریر یکم مارچ ۱۹۴۳ء کی ہے لیکن اُن کی کتاب کے جس نسخہ سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے اُس کی تاریخ اشاعت ۱۹۷۰ء ہے جس میں ڈاکٹر صاحب اپنے تحریر کردہ دیباچہ کی غلطی کی بآسانی اصلاح کر سکتے تھے۔ کانٹ اور ہیگل کی تمثیل پر آنحضرت کو مذہبی واردات کے معاملے میں دوسرے صوفیا کے ساتھ شامل کر کے کیا پیغمبرانہ وحی اور صوفیانہ واردات کو محض مدارج کے فرق پر قیاس نہیں کیا جا رہا؟ رہا یہ سوال کہ سورہ الحج کی آیت وما ارسلنا من رسول ولا نبی اذا تمنیٰ القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن۔ ثم یحکم اللہ آیاتہ سے علامہ اقبال نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبرانہ وحی میں امکان خطا پایا جاتا ہے۔ عرض یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ جس سیاق و سباق میں علامہ اقبال نے اس آیت کا حوالہ دیا ہے وہاں بات صوفیانہ واردات کی ہو رہی ہے اور علامہ اقبال مسیحی تصوف سے ہر مذہب کے تصوف کی طرف آ رہے ہیں اور آپ فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ "امکان خطا صرف مسیحی تصوف میں ہی نہیں اسلامی تصوف میں بھی ہے اور فقط پیغمبر کی وحی ہی اس سے محفوظ ہوتی ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا لیتا ہے۔ اگر علامہ اقبال اپنی تحریر میں آئت کا صرف پہلا ٹکڑا درج کرتے تو ڈاکٹر صاحب کی اس غلط فہمی کا کوئی جواز بھی ہوتا لیکن علامہ اقبال نے تو پوری آیت نقل فرمائی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ پیغمبر اپنے مذہبی تجربے کو عملی معیار Pragmatic test اور نتائج fruits کے اعتبار سے پرکھتا ہے۔ جس سے ڈاکٹر صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ علامہ اقبال وحی میں بھی خطا کا امکان مضمر سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن حکیم نے پیغمبروں کی زبان سے اُن کی مخاطب قوموں کو یہ بارہا چیلنج نہیں دیا کہ اگر تمہیں میرا پیغام قابل قبول نہیں تو تم اپنے طریقے پر عمل کرتے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر عمل کئے جاتا ہوں اور ہم دیکھتے ہیں کہ بالآخر کامیابی کس کے حصّے میں آتی ہے کیا یہ نتائج fruits کے اعتبار سے اپنے پیغام کی عملی معیار Pragmatic test کی کسوٹی پر پرکھ نہیں ہے ؟

بحث بہت پھیل گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک ایک اعتراض کا جواب اگر تفصیل کے ساتھ دیا جائے تو شاید یہ پورا شمارہ بھی اس کا متحمل نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے بزرگ ہیں ہمیں اُن کا بے حد احترام ہے اُن کے علم و فضل میں کلام نہیں۔ ایک مدّت سے ہم سنتے آئے تھے کہ آپ نے خطبات اقبال پر محققانہ کام کر رکھا ہے، جسے چھاپنے کی کسی ادارے کو تاب اور مجال نہیں۔ نیز یہ کہ خطبات اقبال کی علمی کمزوریوں کو خود بھی نشر نہیں کرنا چاہتے ہم نے اس خیال سے کہ اُن کا یہ گلہ بھی دُور کر دیا جائے اور خود ہم خطبات اقبال کی علمی کمزوریوں سے بھی واقف ہو جائیں، اس لئے ہم نے ان کا یہ مقالہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر شائع کر دیا ہے لیکن اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں ہمیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

ہم محترم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے بارے میں سوئے ظن کی بجائے حسن ظن سے کام لیں تو اُن کی تحقیق کے نتائج انشاء اللہ ضرور مختلف نکلیں گے۔ کیونکہ

قیمتِ ہر شے نہ اندازِ نگاہ

ڈاکٹر صاحب کے مقالہ پر سید نذیر نیازی صاحب نے بھی ایک نوٹ لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے جو موصول ہونے پر آئندہ کسی شمارہ میں شائع کر دیا جائے گا ؛